اپنی ہی ماں کا لگایا گہرا زخم

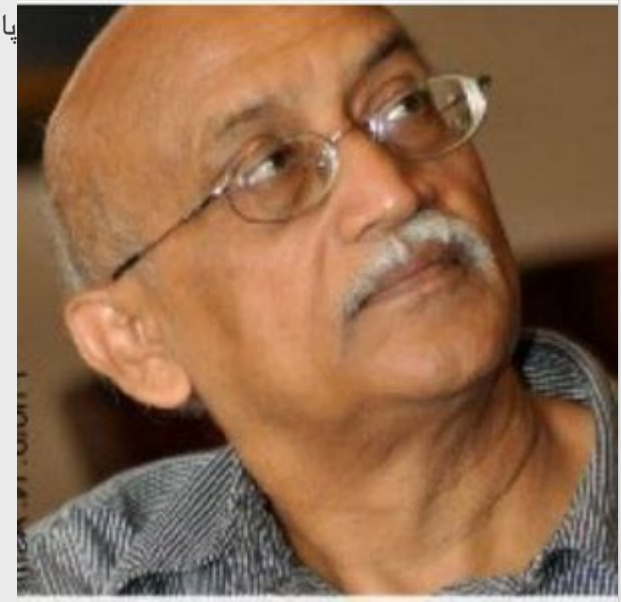

پاؤلا ڈمیٹری نام تھا اس کا۔ اس دن اسے میں نے پہلی دفعہ دیکھا۔

وہ ہمارے سٹنگ روم میں سرجھکائے میری بیوی کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ بچّے باہر کھیل رہے تھے۔ وہ میری بیوی کی ماں تھی۔ کارلا نے مجھے دیکھ کر بڑی سختی سے اپنی ماں سے کہا تھا "کبھی نہیں، کبھی بھی نہیں آنا میرے پاس، اس گھر اور میرے بچوں پر تمہارا سایہ بھی نہیں پڑنا چاہیے۔ کبھی نہیں کبھی بھی نہیں۔ یو آر نومور مائی مدر۔ تم میری ماں نہیں ہو اور ہوگی بھی نہیں۔ "

وہ کارلا کی ہی طرح خوبصورت تھی۔ ساٹھ سال کے لگ بھگ عمر ہوگی اس کی مگر اس عمر میں بھی وہ بلا کی خوبصورت لگ رہی تھی۔ وہ دھیرے سے اُٹھی مجھے دیکھ کر مسکرائی اور خاموشی سے دروازہ کھول کر اپنی گاڑی میں بیٹھی، بھرپور نظروں سے اس نے لان میں کھیلتے ہوئے بچوں کو دیکھا اور خاموش گاڑی کا انجن چلا کر رخصت ہوگئی۔

کارلا سے میری ملاقات کلیولینڈ میں ہوئی۔ اوہائیو کے اس شہر میں وہ مجھے ہسپتال میں ملی۔ میں پاکستان سے ایم بی بی ایس کا امتحان پاس کرتے ہی نکل کھڑا ہوا اور نیویارک میں جا کر بسیرا ڈال دیا تھا۔ پیسوں کی کمی نہیں تھی اور ڈیڈی کے تعلقات بھی تھے۔ ڈیڈی سرکاری ملازم تھے۔ تنخواہ کے ساتھ دوسرے وسائل بھی تھے جن کی وجہ سے کبھی بھی روپے پیسوں کی کمی کا سامنا نہیں ہوا۔ دوسرے وسائل کا مجھے کوئی خاص اندازہ پاکستان میں رہ کر نہیں ہوا۔

خاص طور پر اس عمر میں جب میں اسکول اور کالج میں پڑھتا رہا تھا بلکہ میڈیکل کالج کے شروع کے برسوں میں تومیں یہی سمجھتا رہا کہ زندگی میں ہر ایک کے پاس اسی قسم کے وسائل ہوتے ہیں۔ لیکن جلد ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ ڈیڈی کے زیادہ تر وسائل غیر قانونی بلکہ اسلامی نقطہ نظر سے حرام بھی ہیں۔ لیکن ہمارے گھر میں اور ہمارے ملنے جلنے والوں کے گھر میں حرام حلال کا اپنا ایک خاص مفہوم ہوتا ہے۔ ڈیڈی بھٹو کے زمانے میں شراب پیتے تھے اور عید کی نماز گورنر ہاؤس میں پڑھتے تھے۔

ضیاء الحق کے زمانے میں بھی شراب تو نہیں چھوڑی مگر آفس میں پابند نماز ہوگئے۔ باقی رہا سہولتوں کا ناجائز استعمال اور سرکاری منصوبہ جات میں ہیرا پھیری، کمیشن میں خاطر خواہ حصہ، یہ کام کم یا زیادہ تو ہوتے رہے مگر ختم نہ ہوئے تھے نہ ہوں گے۔ اب میں سوچتا ہوں کہ اگر وہ یہ سب کچھ نہ کرتے توشاید ہم سب بھائی بہن کبھی بھی اچھے اسکول کالج میں نہ پڑھ سکتے اور نہ ہی پیشہ ورانہ کالجوں میں تعلیم حاصل کرسکتے۔ آج ہم سب لوگ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں، پروفیشنل ہیں اور ایسی جگہوں پر کام کررہے ہیں جہاں کوئی بے ایمانی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

میں نیویارک میں کوئنز کے علاقے میں ایک اپارٹمنٹ میں اپنے دوسرے دوستوں کے ساتھ رہا، وہاں ہی رہ کر یو ایس ایم ایل ای کے امتحان کی تیاری کی۔ ہم چار دوست تھے اور ہم چاروں نے ہی کاپلان کے ادارے میں داخلہ لے لیا تھا۔ کاپلان سینٹر کی برانچیں پورے امریکہ میں موجود ہیں جہاں یو ایس ایم ایل ای کے امتحان کی تیاری کرائی جاتی ہے۔ ان کی بھاری فیس ہوتی ہے لیکن اگر دیکھا جائے تو یہ بھاری فیس، امتحان میں پاس ہوکر ڈاکٹر بن جانے کے بعد ملنے والی تنخواہ کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے۔

ہم چاروں نے دل لگا کر یہ کورس کیا پھر بہت ہی اچھے نمبروں سے پاس بھی ہوگئے۔ اس زمانے میں امریکہ کے حالات ڈاکٹروں کے لیے بہت ہی سازگار تھے اور ہمارے نمبر بھی اچھے تھے۔ نمبر اگر اچھے ہوں تو رنگ نسل مذہب اعتقادات کچھ بھی راہ میں حائل نہیں ہوتے ہیں۔

امتحان پاس ہونے کے بعد ہم لوگوں نے میچنگ پروگرام میں درخواستیں ڈال دی تھیں۔ مجھے شروع دن سے ہی شوق تھا کہ سرجری میں ٹریننگ لوں گا اور خدا کا کرنا یہ ہوا بھی کہ سرجری میں ہی مجھے کام بھی مل گیا تھا۔ نہ جانے کیوں شروع میں ڈینور کے نام سے پریشان ہوگیا تھا کہ کون پہاڑوں پر کام کرے گا۔ آدھے دل کے ساتھ میں وہاں انٹرویو دینے گیا مگر ڈینور آتے ہی مجھے اس کی خوبصورتی نے اپنا گرویدہ بنالیا تھا۔ ڈینور اور اس کے اِرد گرد کا سارا علاقہ مجھے دل سے بھاگیا۔ ہرے بھرے اونچے نیچے پہاڑ، بارش، سردی، بہار کا موسم، خزاں کی ویرانگی سب کچھ تھا اس شہر میں۔

مجھے ہیوسٹن میں بھی نوکری ملی مگر میں نے فیصلہ کیا کہ ڈینور میں رہوں گا۔

ڈینور کا پہلا سال تو اتنی تیزی سے گزرگیا کہ کچھ پتہ ہی نہیں لگا کہ سال کب شروع ہوا اور کب ختم ہوا۔ ایک تو ہسپتال کا پورا نیا نظام پھر کام کے اوقات کار ایسے کہ آدمی کو ہوش ہی نہیں رہتا ہے۔ پاکستان میں پروفیسر صاحب 9 بجے بھی آجائیں تو بڑی بات ہے اور اکثر و بیشتر تو ایسا ہوتا ہے کہ پوری ہاؤس جاب کے دوران پروفیسر صاحب کو پتہ بھی نہیں ہوتا ہے کہ کون کون سے ڈاکٹر ان کے پاس کام کرکے چلے گئے ہیں۔ امریکہ میں سرجری میں روزانہ صبح ساڑھے چار پانچ بجے کام شروع کرنا پڑتا ہے اور تقریباً روز ہی شام کے سات اور کبھی آٹھ بج جاتے ہیں۔ اور جس روز رات کی بھی ڈیوٹی ہو اس دن نہ دن کا پتہ لگتا ہے اور نہ ہی رات کا اندازہ ہوتا ہے۔

چار سال اسی طرح سے گزرگئے۔ بیچ میں میں دس، دس دن کے لیے تین دفعہ پاکستان بھی ہو آیا تھا۔ شروع میں میں نے کبھی سوچا بھی نہیں کہ میں پاکستان کے علاوہ کہیں اور بھی کام کروں گا۔ کیونکہ بنیادی طور پر پر مجھے پاکستان اور یہاں کے لوگوں سے محبت تھی اور یہ بھی احساس کہ کتنے کم پیسے خرچ کرکے میں ڈاکٹر بن گیا تھا۔ میں آج حساب لگاتا ہوں کہ پورے پانچ سال میڈیکل کالج میں مشکل سے پانچ ہزار روپے کالج اور امتحان کی فیسوں کی مد میں خرچ ہوئے ہوں گے۔

امریکہ میں صرف کالج کے پانچ سال کی فیس کم از کم تین لاکھ ڈالر ہوجاتی ہے پھر اوپرکا خرچ تو ہے ہی۔ ایک عام امریکی گھرانہ اپنے بچوں کو میڈیکل کالج یا دوسرے اداروں میں اپنے خرچ سے پڑھا ہی نہیں سکتا ہے کیونکہ اتنے پیسے خرچ کرنے کی سکت کسی بھی خاندان میں نہیں ہوتی ہے۔ وہ تو بھلا ہو امریکن بینکنگ کے سسٹم کا جس میں تعلیم حاصل کرنے والوں کو کم سود پر تعلیمی قرضہ مل جاتا ہے اور اس قرض کی بنیاد پر بچّے تعلیم حاصل کرتے ہیں۔

ماں باپ روزمرہ کا خرچ برداشت کرتے ہیں اور یونیورسٹیوں کالجوں کی فیس بینک کے قرضوں سے ادا کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ایک امریکی ڈاکٹر، انجینئر بنتا ہے یا پی ایچ ڈی کرتا ہے تو زندگی کا آغاز ایک بڑے قرض کے بوجھ سے کرتا ہے۔ پہلی نوکری کے ساتھ ہی اس قرض کو اتارنا شروع کرتا ہے پھر جب چند سالوں میں اس کی آمدنی ایک خاص حد تک پہنچ جاتی ہے تو قرض کا پرانا بوجھ بھی اُترجاتا ہے۔

پاکستان میں تو میں ڈاکٹر ایسے ہی بن گیا۔ ایک یہ وجہ تھی پھر پاکستان اپنا گھر بھی تھا، اس کے پہاڑوں، دریاؤں،

سمندروں، وادیوں کی اپنی خوبصورتی بھی تھی لیکن اپنے ریذیڈنسی کے آخری سال میں پاکستان جانے کے بعد میں نے فیصلہ کرلیا کہ کبھی بھی پاکستان واپس نہیں جانا ہے۔ مجھے احساس ہوا تھا کہ پاکستان جاتے ہی ڈیڈی اور ان کے دوست میرے لیے کسی بہترین نوکری کا انتظام کردیں گے۔ شاید نہ سی وی مانگا جائے گا نہ ہی انٹرویو ہوگا۔

میں اپنی تمام تر قابلیت کے باوجود زندگی بھر ایک سورس کی گالی سنتا رہوں گا، لوگ میرے پیٹھ پیچھے یہی کہیں گے، ارے یہ فلاں کا بیٹا ہے وہ خود زندگی بھر رشوت لیتے رہے پھر بیٹے کو بھی فٹ کردیا۔ رشوت شاید ڈیڈی کی مجبوری تھی، اچھے طریقے سے رہنے کے لیے ہماری ماں اور ہم سب کو اچھا رکھنے کے لیے مگر میری کیا مجبوری ہوگی۔ فیلو شپ کے بعد مجھے امریکہ میں جہاں چاہوں گا کام مل جائے گا، گوروں، یہودیوں اور ہندوؤں کے مقابلے پر بھی میرے ساتھ نا انصافی نہیں ہوگی۔ میں نے سوچا کہ پاکستان کے قرض کا بوجھ اتنا زیادہ نہیں ہوگا جتنا تکلیف دہ بوجھ ڈیڈی اور ان کے دوستوں کا ہوجائے گا۔

میں نے فیصلہ کرلیا کہ پاکستان واپس نہیں جاؤں گا۔ ڈینور میں چار سال خوب گزرے پھر مجھے بہت ہی اچھی فیلوشپ سرجری میں ہی کلیولینڈ کے مشہور ہسپتال میں مل گئی تھی۔ یہ ایک چنیدہ ہسپتال تھا۔ شاید یہودیوں کو یہاں زیادہ نوکری ملتی ہوگی مگر یہودیوں کے لیے قابل ہونا ضروری تھا۔ میرا سی وی ایسا تھا کہ اس کے مقابلے میں کوئی بھی نہیں ٹھہرا۔

کلیولینڈ کے پہلے ہی سال میری ملاقات کارلا گنوچی سے ہوگئی وہ بھی اسی ہسپتال میں فیلوشپ کرنے نیویارک سے آئی تھی۔ بچوں کے وارڈ میں کام کررہی تھی۔ وہ روم میں ایستادہ کسی پرانے مجسمہ کی طرح حسین تھی۔ نام سے ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ اس کا تعلق اٹالین گھرانے سے ہوگا۔ امریکہ بھی کیا خوب ملک ہے، ساری دنیا کے مہاجرین امریکہ میں آکر بس گئے ہیں اور بستے چلے آرہے ہیں اور آنے کے بعد یہ دھرتی کسی کو مایوس بھی نہیں کرتی ہے۔ یورپ، افریقہ، ایشیا، براعظموں کے ہر ملک کے لوگوں کے لیے راستے کھلے ہوئے ہیں وہ آتے ہیں اور آکر یہاں رچ بس جاتے ہیں۔

مزید پڑھنے کے لیے اگلا صفحہ کا بٹن دبائیں

کارلا کے دادا پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں اٹلی سے نیویارک آئے تھے۔ نیویارک میں اٹالین لوگوں نے اپنی ایک ایک دنیا بسائی ہوئی ہے۔ امریکہ میں رہتے ہوئے بھی وہ اٹلی میں رہتے ہیں۔ وہ زمانہ خراب تھا بڑی محنت کی تھی ان لوگوں نے پھر آہستہ آہستہ نیویارک کے باسی بن کر خوب پھلے پھولے تھے۔ کارلا کے باپ اوڈانی گنوچی کا بڑا کاروبار تھا۔ کارلا کے رکھ رکھاؤ میں خاندان کی امارت صاف نظر آتی تھی۔

وہ مجھے ڈاکٹرز لاؤنج میں ملی تھی۔ گہرے سیاہ لانبے بال، خوبصورت ترشے ہوئے، ناک کے دونوں جانب کالی سیاہ آنکھیں اور کتابی چہرے پر خوبصورت پیشانی جس سے وہ بار بار بالوں کی لٹ کو جھٹکے سے ہٹاتی تھی۔ یہ اس کا اسٹائل نہیں تھا بلکہ اس کی شخصیت کا جزو سا بن کر رہ گیا تھا۔

میں نے اسے دیکھا پھر دیکھتا ہی رہ گیا۔ ہم دونوں ہی بیس بال کا فائنل مقابلہ دیکھ رہے تھے۔ دونوں ہی ڈیوٹی پر تھے اور وہ ہفتے کی شام تھی، وہ کھیل میں مکمل طور پر شامل تھی۔ بار بار اس کے چہرے پر لالی کے قمقمے جلتے تھے اور بار بار میرا دل دھڑک دھڑک جاتا تھا۔ اس وقت ہی میں نے طے کرلیا کہ امی کی بھیجی ہوئی ساری پاکستانی لڑکیوں کی تصویریں واپس بھیج دوں گا۔ کارلا کی بائیں ہاتھ کی منگنی والی انگلی خالی تھی۔ میں نے سوچا کہ کہیں اس کا بوائے فرینڈ ہو گا، پتہ نہیں کتنی پرانی دوستی ہوگی اور نہ جانے میری قسمت میں کیا ہو۔

میں نے کھیل کے ختم ہوتے ہی اسے ڈنر کے لیے مدعو کرلیا۔ ہسپتال کے بالکل ہی قریب ایک مشہوراٹالین ریسٹورانٹ میں ہم دونوں نے کھانا کھایا۔ لزانیا کے ساتھ مچھلی، لہسن کے ساتھ ڈبل روٹی، جھینگے خاص اٹالین کری میں اور ساتھ ہی سرخ اٹالین وائن۔ اسی دن مجھے پتہ چل گیا کہ اس کا کوئی بھی بوائے فرینڈ نہیں ہے۔ پھر ہم دونوں کی دوستی بڑھی اور بڑھتی ہی چلی گئی۔ آہستہ آہستہ سب کچھ ساتھ ہی ہونے لگا تھا۔ ساتھ ہی کھانا کبھی اس کے اپارٹمنٹ میں کبھی میرے گھر پر، ساتھ سینما دیکھنا، ساتھ ہی گھومنا، کئی دفعہ میں اس کے ساتھ نیویارک گیا اس کے

باپ سے ملا پھر ہم دونوں کو احساس ہوا کہ ہم دور تک چلے آئے ہیں۔ میں تو اس کی محبت میں گرفتار ہوہی گیا تھا وہ بھی مجھے چاہنے لگی تھی۔ پھر ایک دن میں نے اسے منگنی کی انگوٹھی پیش کردی تھی۔ اس نے مجھے گلے سے لگایا، چوما پھر انگوٹھی پہن لی تھی۔

فیلو شپ کے فوراً بعد ہی ہم دونوں نیوجرسی چلے گئے اور ساتھ ہی کام کا آغاز کردیا تھا۔ ہم دونوں کو ہی ایک اچھے ہسپتال میں بہت اچھی نوکری مل گئی تھی۔ میرے پاس دولت کی فراوانی تھی، مجھے قرض لوٹانا تھا نہ ہی پیسے گھر بھیجنے تھے۔ میں نے کارلا کے لیے ایک خوبصورت سا گھر خرید لیا تھا۔ ہماری شادی بھی ایک یادگار شادی تھی، مسجد میں نکاح، چرچ میں تقریب اور ہوٹل میں ضیافت۔ ڈیڈی، امی اور میرے بھائی بہنوں نے شادی میں شرکت کی تھی۔

اٹالین لوگ بھی پاکستانیوں کی طرح بہت بولتے ہیں، ویسے ہی زور زور سے اور ویسے ہی گرمجوشی سے۔ کارلا کے باپ نے چرچ میں اسے میرے حوالے کیا، میں اسے چوم کر اور ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر باہر نکلا تھا اور ضیافت میں شرکت کی تھی۔ کارلا کا خاندان، دوست اور میرے گھر والوں کے ساتھ چند پاکستانی دوست بھی موجود تھے۔ وہ دن، شام اور رات خوب تھی، مجھے آج بھی سب کچھ ایک خواب کی طرح یاد ہے۔

میں نے نہ جانے کیوں خودبخود شروع دن سے ہی یہ سمجھ لیا تھا کہ کارلا کی ماں نہیں ہے اور پھر ایسا ہوا کہ کبھی بھی اس موضوع پر بات نہیں کی ہم لوگوں نے۔ اس دن گھر میں کارلا کی ماں کو دیکھ کر میں چونک گیا اور خاص طور پر جس طرح سے کارلا نے اس سے بات کی تھی وہ بھی میرے لیے بہت حیران کن تھا۔

جاتے جاتے اس کی ایک خاص نگاہ میں بھول نہیں سکا ہوں جب اس نے مڑ کر دیکھا تھا اور مجھ پر ایک بھرپور نظر ڈالی تھی اور گاڑی نکلتی چلی گئی تھی۔ میں واپس آیا تو دیکھا کارلا صوفے پر خاموش بیٹھی کھڑکی سے دور درختوں کے جھنڈ میں کچھ تلاش کررہی ہے۔

مجھے دیکھ کر وہ دھیرے سے مسکرائی، ایک اُداس سی مسکراہٹ، آہستہ سے بولی، ”یہ میری ماں تھی، پاؤلا۔ ایک زمانہ تھا میں اسے تلاش کرتی رہی نہ جانے کہاں کہاں مگر نہیں پاسکی اسے۔ نہ جانے کتنے سالوں تک اس کے خواب بُنتی رہی، اپنے دماغ میں اس امید کے ساتھ ایک دن میری ماں جہاں بھی گئی ہے یکایک واپس آجائے گی مگر ایسا نہیں ہوا۔ “ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملارہے تھے۔

میں خاموشی سے صوفے پر کارلا کے برابر میں بیٹھ گیا، اس کے ماتھے کو چوما، اس کے گالوں کو چھوا، اپنے ہاتھ میں اس کا ہاتھ پکڑ کر آہستہ سے بولا، ”مگر کارلا اب اگر پاؤلا واپس آئی ہے تو اسے خوش آمدید کہنا چاہیے۔ تمہیں اس کی ضرورت ہے، میرے ماں باپ کبھی پاکستان سے نہیں آئیں گے، بچوں کو گرانڈ پیرنٹس کی ضرورت ہوتی ہے اور تمہاری ماں کو تمہاری ضرورت ہے۔ “

”نہیں“ سختی سے کہا تھا اس نے۔ ”میں چھوٹی سی تھی چار سال کی صرف، کوئی نہیں تھا میرا۔ اس عمر میں کوئی بھی نہیں ہوتا ہے صرف ماں ہوتی ہے۔ وہی سمجھتی ہے اتنے چھوٹے بچّے کی زبان، اس کی ضرورت پوری کرتی ہے، اس کے مسائل کو سمجھتی ہے، اس کے جذبات کا خیال رکھتی ہے اور وہی عمر ہوتی ہے جب اس بچّی کے پیار میں صرف پیار ہوتا ہے۔ کوئی غرض نہیں۔ مجھے یاد ہے اس مہربان ماں کا پیار بھرا چہرا۔ جھکی جھکی نگاہیں، بار بار چومنا، گلے لگانا، پھر ایک صبح یہ سب کچھ نہیں تھا۔

”کچھ بھی نہیں۔ مجھے تو یاد نہیں ہے کہ میرے باپ پر کیا گزری، مجھے صرف یہ یاد ہے کہ میری ماں میرے پاس نہیں تھی۔ اٹھارہ سال کی عمر تک میرا باپ میری پرورش کرتا رہا، کبھی ماں بن کر کبھی باپ بن کر، کبھی بھائی بن کر کبھی بہن بن کر۔ مجھے سب یاد ہے اسکول سے کالج تک ایک ایک دن، ایک ایک لمحہ، ہر جگہ جہاں مجھے ضرورت پڑی کہ کسی کی انگلی پکڑلوں، کسی کا ہاتھ تھام لوں، کسی کے کندھے پر سر رکھ دوں، کسی کی چھاتی میں مُنھ چھپا کر سو جاؤں، مجھے میرا باپ موجود ملا۔ “

”ہر ہر طرح سے ہر وقت میرے ساتھ، میرے پاس۔ ان اٹھارہ سالوں میں میرے باپ نے کبھی بھی مجھ سے میری ماں کے بارے میں کوئی بُری بات نہیں کی۔ مجھے یاد ہیں ان کے جواب۔ نہیں نہیں وہ زندہ ہے۔ وہ ضرور تمہیں یاد کرتی ہوگی، ہاں کسی جگہ مجبوری میں پھنس گئی ہوگی۔ بہت اچھی تھی، وہ تم سے بہت پیار کرتی تھی۔ ضرور آئے گی ایک دن تم سے ملنے تمہارے پاس۔ کیسے دور رہ سکتی ہے تم سے۔ بہت اچھی تھی وہ۔ “ یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگئی۔ کھڑکی سے باہر ہلتے ہوئے پتوں کو دیکھتی رہی پھر آہستہ سے بولی۔

”وہ سب جھوٹ تھا۔ میری اٹھارویں سالگرہ کے دوسرے دن پاپا نے مجھے بتایاکہ وہ سب کچھ چھپاتے رہے تھے مجھ سے کیونکہ وہ میرے ذہن میں، میرے دماغ میں کوئی نیگیٹو بات نہیں ڈالنا چاہتے تھے، جب تک کہ میں خود اچھا بُرا نہ سمجھوں۔ اب ایسی عمر تھی کہ وہ مجھے بتادیں اور انہوں نے سالوں بعد بھی بڑے کرب سے بتایا تھا کہ پاؤلا یکایک چھوڑگئی تھی انہیں کسی دوسرے آدمی کے لیے۔ کسی دوسری ریاست کے کسی اور شہر میں جا کر آباد ہوگئی تھی اس کے ساتھ اور وہاں سے ہی طلاق لے لی تھی ان سے۔ “

”کوئی ماں ایسا نہیں کرتی ہے کہ بچّی کو چھوڑجائے اس طرح سے کہ واپس آکر دیکھے بھی نہیں، چومے بھی نہیں، چھوئے بھی نہیں مگر اس نے ایسا ہی کیا۔ پاپا نے کہا تھا کوئی مجبوری ہوگی کوئی مسئلہ ہوگا مگر بیٹی میں تمہیں یہ سب کچھ نہیں بتاسکتا تھا، تم بچّی تھیں، چھوٹی تھیں، زخمی ہوجاتیں تو شاید یہ زخم کبھی بھی نہیں بھرتا۔ اٹھارہ سال کی عمر میں میری ماں مجھ سے چھن گئی، مرگئی، میرے لیے۔ مجھے یاد تھا کہ یہی کہا تھا اس نے مجھ سے جب میں نے اس سے اس کی ماں کے بارے میں پوچھا تھا۔ “

”اس دن سارا کچھ بھاپ بن کر اُڑ گیا، میں نے تصورات کا ایک محل بنایا ہوا تھا جس میں میری ماں ایک شہزادی کی طرح بیٹھی اوپر بادلوں سے مجھے دیکھ رہی تھی، مجھے یاد کررہی تھی، میری حفاظت کررہی تھی، میرے لیے راہیں بنارہی تھی مگر سب کچھ جھوٹ نکلا۔ ۔ ۔ ۔ محض ایک جھوٹ وہ ایک چھوٹی سی ننھی سی کمزور سی بچّی کو چھوڑ کر اپنے کسی بوائے فرینڈ کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ میرے باپ کو چھوڑنے کا حق تھا اسے، کیونکہ وہ تو ایک کاغذی بندھن تھا، ایک مذہبی رشتے کے تحت شوہر اور بیوی بن گئے تھے وہ لوگ۔ اور شوہر اور بیوی میں تو محبت ختم ہوسکتی ہے۔ مجھے چھوڑنے کا کوئی حق نہیں تھا انہی میں ان کی بیٹی تھی ان کے خون کا ایک حصہ، ان کے وجود کا دوسرا روپ۔ اور اب میرا حق ہے کہ میں اسے کبھی بھی اپنی زندگی میں داخل نہ ہونے دوں۔ ۔ ۔ ۔ “